R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ [illegible] پیسے

جلد ۲۴ - شمارہ ۱	ایڈیٹر:- آل احمد سرور	یکم جنوری ۱۹۶۵ء

اداریہ

پیچھے دیکھنا یا آگے

لیجیے ۱۹۶۴ء بھی ختم ہوگیا اور اب ہم نے ۱۹۶۵ء میں قدم رکھ دیا۔

اردو دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ جب نیا سال شروع ہوتا ہے تو دل میں نئی امیدیں کروٹیں لیتی ہیں، ہم اپنے دل سے نئے عہد و پیمان کرتے ہیں، ہم نئے سرے سے زندگی شروع کرتے ہیں۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم جو کچھ ہو چکا اسے نظر میں ضرور رکھیں، مگر یہ نہ کریں کہ گزری ہوئی باتوں کے دھیان میں نئے امکانات کو فراموش کر دیں۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے کیونکہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ ہمیں اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنی ہے اور نئے ولولے کے ساتھ کاروبار شوق میں لگ جانا ہے۔

یہ سال ملک پر سخت گزرا۔ گرانی ہوش ربا ہوگئی۔ قدم قدم پر اپنے منصوبوں کی کوتاہیاں ظاہر ہوئیں۔ غذا کے لیے ہمیں دوسروں کا کچھ زیادہ ہی دست نگر ہونا پڑا۔ ملک اپنے معمارِ اعظم سے محروم ہوگیا۔ بچاؤ کا کام اور ترقی کا کام، دونوں کاموں کی رفتار ہماری خواہش کے مطابق تیز نہ ہوسکی۔

مگر ہمیں اب صرف اپنی کوتاہیوں کا ماتم نہیں کرنا چاہیے انھیں دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی نوعمر جمہوریت کی حفاظت کرنا ہے، ہمیں جمہوری روایات کو ترقی دینا ہے ہمیں قومی مزاج اور قومی کردار پیدا کرنا ہے۔ ہمیں جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی پر زور دینا ہے۔ ہمیں اقلیتوں میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے خول سے نکلیں اور اکثریت کے قریب آئیں۔ ہمیں اکثریت پر یہ واضح کرنا ہے کہ مطمئن اور آسودہ اقلیت، جمہوریت کے لیے طاقت ہوتی ہے اور غیر مطمئن اور ناآسودہ اقلیت، ملک کو کمزور کرتی ہے۔ ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا کہ جب تک اقلیت کے سب حقوق تسلیم نہیں کر لیے جائیں گے، ہم روٹھے ہوئے بیٹھے رہیں گے، بلکہ ہمیں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کے ساتھ قومی اور ملکی کاموں میں بھی لگ جانا ہے۔ ہمیں ہر قومی زبان کے حق کو منوانا ہے ہمیں اردو کے ساتھ انصاف کے نعرے کو قومی نعرہ بنانا ہے، مگر اردو دوستوں کو بھی یہ سیکھنا ہے کہ اردو کی ترقی پورے ملک کی ترقی اور خوش حالی کے ساتھ وابستہ ہے اور ملک ترقی کرے گا تو اردو کے لیے بھی ترقی کے راستے نکلیں گے۔ ہمیں اردو زبان کو جدید دور کی ضروریات کے قابل بنانا ہے اور اردو زبان کی قدروں، روایات اور خصوصیات سے جدید دور میں کام بھی لینا ہے۔ خدا کرے ہم اس سال اپنی زبان کی، اپنی قوم کی اور انسانیت کی خدمت کے فریضے سے پہلے کے مقابلے میں بہتر طریقے سے عہدہ برآ ہوسکیں۔

اس شمارے میں

سکینڈ بن

سالانہ کانفرنسوں کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں ہر ادارہ جو کوئی بھی علمی حیثیت رکھتا ہے اپنی سالانہ کانفرنس ضرور کرتا ہے۔ کانفرنس کی کامیابی اس میں سمجھی جاتی ہے کہ اس میں کتنے نمائندے شریک ہوئے، اس کا افتتاح کس بڑے آدمی نے کیا، نمائندوں کے اعزاز میں کتنے لنچ اور ڈنر دیے گئے، بیرونی ممالک سے کتنے نمائندے آئے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ علمی مقالوں کا معیار کیا تھا، بحث سطحی تھی یا گہری، علمی دنیا میں ہمارا قدم کتنا آگے بڑھا۔ ہاں کانفرنس کرنے والوں کو آئندہ سال کے لیے کچھ عہدے ضرور مل جاتے ہیں۔ آخر یہ بھی تو کوئی چیز ہے۔

ہندوستان میں دو بہت بڑی کانفرنسیں ہر سال ہوتی ہیں۔ ایک سائنس کانگریس اور ایک اورینٹل کانگریس۔ ان میں نمائندوں کی تعداد بارہ پندرہ سو کے قریب ضرور ہوتی ہے بیرونی ممالک سے بھی دس بیس نمائندے آ جاتے ہیں۔ اگر ان کانفرنسوں میں کسی کو شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے تو اسے معلوم ہو گا کہ یہ اب اچھے خاصے تماشے بن گئے ہیں پروگرام ایسا ہوتا ہے کہ نمائندے ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں ہوتے۔ افتتاحی اجلاس میں تو بڑا مجمع ہوتا ہے لیکن سیکشنوں کے جو اجلاس ہوتے ہیں ان میں جلدی جلدی پرچے پڑھے جاتے ہیں اور کچھ تو نہیں پڑھے ہوئے مان لیے جاتے ہیں۔ ہر مقرر وقت کی تنگی کا عذر کرتا ہے مگر لمبی تقریر کرتا ہے بات یہ ہے کہ ان علمی کانفرنسوں میں شرکت کرنا یا ان کے لیے پرچہ بھیجنا بھی ایک اعزاز سمجھ لیا گیا ہے جس کی بنا پر مستقبل بنتا ہے علم کی سرحدوں کو وسیع کرنے، مسائل پر علمی تجزیہ کرنے، علم کو آگے بڑھانے کی کسے فکر ہے۔ آزادی کے بعد ان اچھی خاصی چیزوں کا بھی ایک کاروبار ہو گیا ہے۔ کاش اس کاروبار کے بجائے وہ جذب و جنون ہوتا جس سے قوموں کی تقدیریں بنتی ہیں۔

ایسی ہی ایک کانفرنس میں ایک دور دراز جگہ سے ایک صاحب تشریف لائے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ فلاں سیکشن کا اجلاس شروع ہو رہا ہے آپ تشریف لے چلیے۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے وزیر تعلیم سے ملنا ہے۔ یہاں آیا ہوں تو ان سے ملتا چلوں۔ آئندہ شاید ان سے کوئی کام پڑے۔ اس کے بعد وقت ہوا تو ذرا کچھ دوستوں سے ملوں گا۔ بیوی نے ساڑیوں کی فرمائش کی ہے وہ خریدنا ہیں، اور فلاں صاحب کے یہاں کھانا ہے۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ سیکشن میں پہنچے تو بقول ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پانچ متنفس بیٹھے ہوئے تھے انھیں میں صدر، سکریٹری اور سامعین تھے سامعین میں ایک والنٹیر بھی تھا صدر کے خطبے کے علاوہ دو مقالے پڑھے گئے اور آٹھ پڑھے ہوئے مان لیے گئے۔ اجلاس نہایت کامیاب رہا۔

اردو تعلیم کے چند مسائل

آزادی ملک و تقسیم ملک کے بعد سے اردو زبان کی مخالفت عام ہوئی رفتہ رفتہ جملہ سرکاری و غیر سرکاری دفاتر سے اس کا اخراج ہو رہا ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے ابتدائی تعلیم پورے اتر پردیش (یو۔پی) میں ہندی زبان میں دی جا رہی ہے۔ اردو زبان اختیاری حیثیت سے سہ لسانی فارمولے کے تحت درجہ ششم سے رائج ہے جن جگہوں میں جد و جہد کے بعد ابتدائی تعلیم کا انتظام اردو میں کیا گیا ہے صرف وہاں اردو کی تعلیم پرائمری درجات میں ہے۔

اردو ہندی زبان کا فرق عام بول چال میں نمایاں نہیں ہوتا لیکن بڑا فرق ہے۔ ہندی میں بعض الفاظ مؤنث ہیں وہی الفاظ اردو میں مذکر بولے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہجاؤں میں بھی فرق ہے۔ "تلفظ" کا بھی فرق ہے۔ ہندی میں ث، ز، ض قسم کی کوئی چیز نہیں ہے وہاں 'ش'، اور 'ز' کی جگہ س اور ج بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ س، ص، ث، ت، ط، ز، ذ، کی آواز کا کوئی خاص فرق محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں سب کا فرق محسوس کیا جاتا ہے۔ ہندی میں عام طور پر پورا حروف الگ الگ لکھا جاتا ہے اردو میں عام طور پر حروف ملا کر اور آدھے لکھے جاتے ہیں۔ بچے درجہ پانچ تک صرف ہندی پڑھتے ہیں پانچ سال کی مدت میں کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں لہذا جو کچھ انھوں نے سیکھا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ درجہ ششم میں اردو پڑھتے وقت ان کو بڑی پریشانی تلفظ کی ہوتی ہے جملے کی بناوٹ میں بھی پڑتی ہے۔ تلفظ غلط ہونے کی وجہ سے املا بھی غلط لکھتے ہیں۔ ٹریننگ اسکولوں و کالجوں میں مادری زبان کی حیثیت سے صرف ہندی زبان کا طریقہ تعلیم اور اصول تعلیم بتایا جاتا ہے۔ لہذا ٹرینڈ ٹیچرس کے سامنے بھی یہ مسئلہ آتا ہے، وہ کس طرح بچوں کی اصلاح کریں۔ اس چیز کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے طریقہ تعلیم اور اصول تعلیم کی تعلیم ٹریننگ اسکولوں و کالجوں میں دکھائے یا اس کے لیے الگ ریفریشر کورس کھولے جائیں۔

سہ لسانی فارمولے کے تحت بچوں کو جو ریڈریں پڑھائی جا رہی ہیں یہ کتابیں پہلے کے درجات میں ہندی میں پڑھ چکے ہوتے ہیں اردو میں پڑھتے ہوئے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی لہذا بچوں کے لیے نئی کتابیں لکھوائی جائیں جو نفسیاتی طور سے ان کے ذہن کے مطابق ہوں۔ دوسرے اختیاری مضمون میں جو اردو کی کتابیں ہیں وہ بھی طلبا کی موجودہ علمی استعداد اور رجحانات کو دیکھتے ہوئے معیار سے اونچی معلوم ہوتی ہیں لہذا یو۔پی بورڈ کے پورے اردو کورس پر ایک نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اردو کی کتابوں کی فراہمی کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ بعض اوقات کتابیں نہ ملنے کی وجہ سے اردو لینے والے طلبا اردو نہیں لیتے ہیں یا اردو میں کمزور رہ جاتے ہیں کیونکہ ان میں چار پانچ ماہ تک وہ بغیر کتابوں کے رہتے ہیں۔ (مسز بیت الحسن لاہری)

ڈاکٹر محمود الٰہی

بیگم مہدی افادی

مہدی افادی کا کون ایسا جاننے والا ہے جو ان کی رفیقۂ حیات مہدی بیگم (عزیز النساء) کے نام سے واقف نہیں اور ان کی وفات کو ایک محسنۂ ادب کی وفات سے تعبیر نہ کرے گا۔ مہدی افادی کا انتقال نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ بیوگی کی طویل مدت گزارنے کے بعد سنہ ۱۹۶۲ء میں مہدی بیگم بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ انھوں نے زبان و ادب کی براہِ راست کوئی خدمت نہیں کی لیکن ان کی یہ خدمت کم نہیں ہے کہ مہدی افادی کے منتشر مضامین اور خطوط کو "افادات مہدی" اور "مکاتیب مہدی" کے نام سے شائع کیا۔ دونوں کتابوں پر بطور دیباچہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مہدی افادی کے سوانحی حالات کی فراہمی کے سلسلے میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور یہ خدمت انھوں نے اس وضع کو قائم رکھتے ہوئے انجام دی۔ مضامین اور خطوط کی فراہمی پھر "افادات" اور "مکاتیب" کی ترتیب، طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے جو ہفت خواں طے کیے تھے ان کا ذکر ان کتابوں کے دیباچے میں ملتا ہے۔ ان کی اشاعت سے مہدی افادی کو نئی نسل نے بھی وہ مقام دیا جس کے وہ مستحق تھے پھر بھی نہیں۔ انھوں نے مہدی بیگم کو بہت سے خطوط لکھے تھے جو ادب کے اچھے نمونے ہیں۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ خیال قائم کرنا غلط نہیں کہ ہماری ادبی تاریخ میں کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا نام بھی باقی رہے گا۔

وہ بڑی باہمت اور پرحوصلہ خاتون تھیں۔ انھیں مہدی افادی کی علمی اور ادبی فتوحات کا عرفان تھا اور ان فتوحات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ بیوگی کی ۴۲ سال کی مدت میں شاید ہی کوئی ایسا دن آیا ہو جب ان کی آنکھ میں آنسو نہ دیکھے گئے ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسا بھی کوئی دن نہیں آیا جب وہ مہدی افادی کے مضامین اور خطوط کو نئے طور پر مرتب کرنے کی دھن میں نہ رہی ہوں یا ان کی "نازنینان حرم" کو الماریوں میں ایک نئے ڈھنگ سے سجانے میں مصروف نہ ہوں۔ وہ ہر روز یہی کھیل بنایا اور بگاڑا کرتی تھیں۔ یہی ان کا معمول تھا اور یہی ان کا حاصلِ زندگی۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھیں کہ وہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے ان کے شوہر کی شخصیت روشن تر ہوتی جائے۔

میں پہلی بار ۱۹۵۸ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گورکھپور میں نئی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی اور اس کے تمام شعبوں میں شعبۂ اردو سب سے کم عمر تھا۔ وہ دیر تک شعبے کے قیام کے محرکات اور اس کے مستقبل پر مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ میں نے ان کتابوں کو جو مہدی افادی کے زیر مطالعہ رہ چکی تھیں، یونیورسٹی لائبریری میں وقف کر دینے کی تحریک کی۔ انھوں نے میری بات مان لی۔ کتابیں زیادہ نہیں تھیں لیکن جو بھی تھیں وہ اپنے فن کی منتخب اور ممتاز تھیں۔ اکثر کتابیں بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ ابھی ابھی پریس سے آئی ہیں۔ کسی کتاب پر کوئی نشان تک بھی نہ تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کتابیں کتنی احتیاط کے ساتھ پڑھی گئیں اور پھر انھیں اتنی مدت تک کس طرح محفوظ رکھا گیا؟ میں نے ان کی فہرست بنالی لیکن ایک دن جب میں انھیں لے جانے لگا تو انھوں نے اتنی حسرت کے ساتھ دیکھا کہ میرا متاثر ہو جانا لازم تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور انھوں نے بے ساختہ کہا کہ انھیں نہ لے جاؤ۔ میں ابھی اتنی گئی گزری نہیں کہ ان کی حفاظت نہ کر سکوں۔ صرف ایک کتاب انھوں نے مجھے دی اور وہ بھی شاید میرا دل رکھنے کے لیے۔ میں ان کے یہاں دوسرے تیسرے جاتا رہا اور ہر بار وہ مجھے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور دیتیں۔ انھوں نے ساری کتابیں دے دیں لیکن وہ دو ایک ایک کر کے۔ وہ وقف کرنے کے بعد بھی کتابوں سے غافل نہیں ہوئیں۔ وہ کبھی کبھی ان کے بارے میں مجھ سے پوچھ لیا کرتی تھیں۔

انھوں نے "مکاتیب مہدی" کے دیباچے میں ان خطوط کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا تھا جو مہدی افادی نے ان کے اور گھر کے دوسرے افراد کے نام لکھے تھے۔ میں نے انھیں یہ وعدہ یاد دلایا۔ انھوں نے خطوط میرے سپرد کر دیے اور اس باب میں میری رائے معلوم کی کہ ان کی اشاعت کہاں تک مناسب ہے۔ میں نے مطالعہ کرنے کے بعد خطوط واپس کر دیے اور کہا کہ اشاعت کے سلسلے میں آپ جو فیصلہ کریں گی وہی مناسب ہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد میں نے پھر یہ موضوع چھیڑا۔ انھوں نے اشاعت کے لیے آمادگی کا اظہار کیا اور خطوط پھر میرے سپرد کر دیے ــ اور ان خطوط کا مجموعہ "صحیفۂ محبت" کے نام سے اس وقت شائع ہوا جب ان کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں! خطوط کی ترتیب کے دوران بعض ناموں کی وضاحت کے سلسلے میں مجھے ان سے قریب قریب روزانہ ملنا پڑتا۔ میں خط کا ایک جملہ پڑھتا تو وہ پورا خط سنانے لگتیں۔ انھیں ہر خط زبانی یاد تھا۔ کبھی کبھی جب وہ کسی نام یا کسی واقعے کی وضاحت کرتیں تو یکایک ان پر یا تو پراسرار خاموشی طاری ہو جاتی یا بے تحاشا رونے لگتیں۔ وہ ۸۰-۸۲ کے پیٹے میں تھیں لیکن ماضی ان کے سامنے حال بن کر آ جاتا

اور وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکیں۔ یہ منزل میرے لیے بڑی صبر آزما ہوتی اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے اس فرض سے میں کس طرح عہدہ برآ ہوا۔ وہ صحیح معنوں میں مہدی افادی کی پرستش کرتی تھیں، انکی بے لوث اور پائندہ محبت کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم برہم، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد کا ذکر وہ اکثر کرتیں اور مہدی افادی کے ان حضرات سے جو روابط تھے ان کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کرتیں۔ شبلی سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی تصنیفات کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں علم و ادب کا سچا خادم سمجھتی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی قائل تھیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اگر کسی نے مرحوم کی دوستی کا حق ادا کیا تو وہ بھائی عبدالماجد ہیں۔ مولانا کی مداح وہ اس لیے تھیں کہ وہ مہدی افادی کے دوستوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کی وفات پر قلم اٹھایا اور دنیا کو اس جوہر قابل سے روشناس کرایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ مہدی افادی کی زندگی میں جو لوگ ان کی دوستی کا دم بھرتے تھے، ان کے مرنے کے بعد وہ ان کی ادبی فتوحات کو موضوع قلم بنائیں۔ مہدی افادی سے سید سلیمان ندوی کے بھی گہرے تعلقات تھے اور پھر وہ معارف کے اڈیٹر بھی تھے۔ مہدی بیگم کا یہ خیال تھا کہ وہ کوئی طویل مضمون لکھیں گے لیکن جب ایک قابل لحاظ مدت تک ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا تو انھوں نے مولانا کو ایک خط لکھا جس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا تھا۔ خط کا ضروری اقتباس یہ ہے۔

"آہ! ان کی موت نے دنیا کی بے وفائی کا ایک زبردست نقشہ میری نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا ہے یعنی دنیاوی تعلقات صرف جیتے جی کے ہیں۔ آنکھ بند ہوتے ہی کوئی یہ بھی جاننا نہیں چاہتا کہ اس سے پہلے ان کا وجود بھی تھا!

ان کی زندگی کا زیادہ تر قیمتی حصہ پردیس ہی میں گزرا۔ کم سے کم جب سے میرا ساتھ ہوا میں نے ان کے دوستوں کو ہمیشہ اس طرح ان کا ذکر کرتے سنا کہ بعض وقت ہم دونوں بہت متاثر ہوتے تھے کہ پردیس میں بھی ایسے ایسے محبتی اور قدردان موجود ہیں۔

لیکن مرچکنے والی چیز سوا نہیں ہوتی تاہم آپ چند صاحبوں کی نسبت میرا خیال تھا کہ نہیں معلوم کس کس طرح اظہار غم فرمائیں گے لیکن مجھے کتنی عبرت ہوئی جب میں نے کسی اخبار یا رسالہ میں آپ لوگوں کی ایک سطر بھی تعزیت کی نہیں دیکھی۔ ہاں بھائی عبدالماجد صاحب نے البتہ دوستی کا پورا حق ادا کیا۔

آپ معاف فرمائیں گے، یہ شکایت صرف دعوے کی ہے اور تعلقات کی بنا پر خواہ دل پر کتنا ہی صدمہ ہو، پھر بھی خلوص اظہار چاہتا ہے۔"

مہدی بیگم جن حالات کا شکار تھیں، ان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس قسم کے جملے مہدی افادی کے دوستوں کو لکھیں وہ چاہتی تھیں کہ دنیا اس دل سے ان کی موت پر روئے جس دل سے وہ خود رو رہی تھیں۔ وہ دنیا کی محبت کو اپنے پیمانۂ محبت سے ناپ رہی تھیں، اسی لیے ان کو مایوسی ہوئی۔

مہدی بیگم کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی اس زمانے میں مسلم خواتین میں تعلیم کا رواج کہاں تھا لیکن مہدی افادی کے فیض رفاقت سے انھوں نے زبان پر اچھی خاصی قدرت حاصل کر لی تھی۔ ان کے خطوط میں اتنی ادبی چاشنی ہوتی تھی کہ ان سے مہدی افادی کے ذوق ادب کو تسکین ملتی تھی۔ "افادات" اور "مکاتیب" کے دیباچے سے ان کے ادبی سلیقے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا جملوں سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مافی الضمیر کے اظہار پر پوری قدرت رکھتی تھیں یہاں ان کا انداز تحریر واضح کرنے کے لیے ایک خط کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں جو مہدی بیگم نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو یعنی مہدی افادی کی وفات کے تقریباً ایک ماہ بعد مولانا عبدالماجد کو لکھا تھا۔

"آپ کا خط ملا اور ہمدم بھی دیکھا۔ اس خلوص کا دلی شکریہ۔ وہی شاندار زندگی، جس پر جان دیتی تھی، آج میرے لیے سخت مصیبت ہو رہی ہے۔ ان کی وہ بے شمار کتابوں کا ذخیرہ، جس تک نوکروں کا ہاتھ پہنچنا جرم تھا، اگر کوئی دوسرا دیکھنا چاہتا تھا تو بڑے تامل کے ساتھ اس کے ہاتھ کی صفائی کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد دیتے تھے، جنکی حفاظت جیتے جی میں اپنا فرض سمجھتی ہوں، اب ان کتابوں کے ساتھ اپنے بچے ہی اگر بے احتیاطی کریں گے تو میں اس کو کن آنکھوں سے دیکھوں گی اور کس دل سے برداشت کروں گی؟ ...... آہ ایک کمزور بلکہ کمزور ترین ہستی پر بہت بڑی ذمہ داری چھوڑ گئے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

غزلیں

سید حرمت الاکرام

زندگی کتنی ہے گراں یارو
ہم ہیں اور فکرِ دو جہاں یارو

کب کوئی درد کی زباں سمجھا
کون ہو دل کا ترجماں یارو

زندگی کو پکارتا ہوں میں
زندگی کھو گئی کہاں یارو؟

جب اترتی ہو دل میں کوئی شعاع
کس نے دیکھا ہو وہ سماں یارو

ان کی منزل کی راہ کوئی نہیں
ایک صحرا ہے کہکشاں یارو

بڑھتا جاتا ہے زندگی کا بوجھ
دل پہ ہر سانس ہو گراں یارو

کس کو بیگانہ ہم کہیں لیکن
کوئی اپنا نہیں یہاں یارو

رات روتی ہے کس کی فرقت میں
چاند ہے کیوں دھواں دھواں یارو

سوچتا ہوں کہ زندگی جیسے
تھی کوئی شئی رائیگاں یارو

کس کو جہاں بنا کے لائیں ہم
سونی سونی ہے بزمِ جاں یارو

یہی حرمت کہ ہے قتیلِ حیات
زندگی کا تھا راز داں یارو

آزاد گلاٹی

اب تک ترے خیال سے وابستگی تو ہے
ظلماتِ غم میں درد کی مشعل جلی تو ہے

اب تجھ پہ منحصر ہے اسے جو بھی رنگ دے
جو بات ہم نے کہنی تھی تجھ سے کہی تو ہے

لبریز ہو کے جیسے چھلکنے لگا ہو جام
کتنے غموں کو زندگی اک گھونٹ ہی تو ہے

یہ اور بات ہے کہ نہ پہنچی وہ آپ تک
دھڑکن نے دل کی آپ کو آواز دی تو ہے

ہم اڑ رہے ہیں جن کے ترے نقشِ پا کی خاک
یہ شکر ہے نصیب میں آوارگی تو ہے

جاوید وششٹ

ماہ و انجم بن گئے جو اس دہن کی بات تھی
دوسرے الفاظ میں اک گلبدن کی بات تھی

کیوں خفا بیٹھے ہو آخر تم نے کیا سمجھا اسے
وہ فقط اک جامِ شیریں یا دہن کی بات تھی

فصلِ گل میں کس لیے کرتے خزاں کی گفتگو
وہ تو اک بدلے ہوئے رنگِ چمن کی بات تھی

آج تنہا ہو کیوں کل تک ہماری بزم میں
زندگی کا ذکر تھا دار و رسن کی بات تھی

مہر بر لب تھا زمانہ دیکھ جس کے خوف سے
تھی جو ہونٹوں پر مگر تجدیدِ فن کی بات تھی

نارسائی جس کو سن کر وجد کرتی ہے ہنوز
وہ کسی کافر ادا کے بانکپن کی بات تھی

آج وہ بھی تشنہ کامی کا گلہ کرنے لگے
جن کے لب پر کل تلک گنگ و جمن کی بات تھی

دوستوں کی بے وفائی تھی تو کہنے کی مگر
کس سے ہم کہتے کہ اپنی انجمن کی بات تھی

ہم غزل میں ان سے کہہ کر حالِ دل خوش ہیں مگر
وہ یہی سمجھا کیے شعر و سخن کی بات تھی

تشنہ لب جاوید بیٹھے رقص سے دیکھا کیے
میکدے کا پاس کچھ اپنے چلن کی بات تھی

قیس رامپوری

عقل والے تو چلو ہنس کے ٹھہر جائیں گے
دیکھنا یہ ہے کہ دیوانے کدھر جائیں گے

آگہی زلف اگر ہم کو میسر ہو دوست
ہم سے لگتا تو کبھی خود بھی سنور جائیں گے

جانِ گلشن سبھی یہ پھول نکھر جاتا ہوں
آپ کے ایک تبسم سے نکھر جائیں گے

تم غمِ زیست اگر ساتھ نبھایا تو نے
ہم حدودِ غمِ جاناں سے گزر جائیں گے

قیس دوست اٹھے تو وہ اٹھ آئے مگر
اب یہ کہتے ہیں کہ جائیں تو کدھر جائیں گے

وزیرِ تعلیم سے انجمن کے وفد کی ملاقات

لکھنؤ ڈاک سے۔ انجمن ترقی اردو اتر پردیش اور اردو کلب کے اراکین پر مشتمل ایک وفد نے پنڈت آنند نرائن ملا صدر ریاستی انجمن ترقی اردو کی قیادت میں مرکزی وزیرِ تعلیم سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کی۔ وفد کے دوسرے اراکین میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، بیگم حامد حبیب اللہ، سردار سریندر پرتاپ سنگھ، نواب فخر حسین، کستوری لال نسیم پنجابی اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی شامل تھے۔

پنڈت آنند نرائن ملا نے وزیرِ تعلیم کے سامنے یہاں اردو تعلیم کے متعلق تمام دشواریوں کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ قومی یک جہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جائے کسی کی مادری زبان پر پابندی عائد کر کے اور اس کو ختم کر کے قومی یک جہتی کا خواب کیسے پورا ہو سکتا ہے۔ ملا صاحب نے سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو نظر انداز کیے جانے، کارپوریشن اور ضلع پریشد کے اسکولوں میں اردو نہ پڑھانے نیز سرکاری امدادی اسکولوں میں اردو کی تعلیم ختم کرنے کے متعلق مختصر طور پر بتایا۔ وزیرِ تعلیم نے کہا کہ اگر اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں تو مرکز ان کو امداد دے گا۔

(الجمعیۃ دہلی)

التماس

میں اردو کے عظیم المرتبت شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی نظمیہ شاعری پر ناگپور یونیورسٹی میں تحقیقی کام (ریسرچ) کر رہی ہوں میرا خیال ہے کہ سیماب نے ان نظموں کے علاوہ جو ان کے مجموعوں کارِ امروز، ساز و آہنگ، شعرِ انقلاب میں شائع ہو چکی ہیں کچھ اور نظمیں بھی ان کتابوں کی اشاعت کے بعد کہی ہوں گی مجھے ان نظموں اور علامہ پر لکھے گئے مقالوں، مضامین کی سخت ضرورت ہے ہند و پاک میں جن حضرات کے پاس یہ چیزیں ہوں از راہِ کرم عاریتاً عنایت فرما کر میرے تحقیقی کام میں میری مدد فرمائیں۔

(زرینہ ثانی ایم۔ اے ۳۶۱۔ شنکر نگر ناگپور ۱۰ مہاراشٹر)

ڈاکٹر عبدالودود

پاکستانی کویتا کی بھارتی آتما

(ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے مضمون پر ایک نظر)

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ایک مضمون ۸ر نومبر ۱۹۷۴ء کے دھرم یگ میں شایع ہوا ہے۔ مضمون بڑی محنت سے لکھا گیا ہے جو موثر اور جاندار ہے۔ ان کی یہ کوشش قابل تعریف ہے۔

مضمون میں راہی صاحب کی بعض دلیلیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہندی میں اردو پر لکھنا اور اس طرح ہندی داں طبقہ کو اردو سے واقف کرانا قابل تحسین کام ہے لیکن ہندی داں طبقہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے خیال سے ایسے جملے لکھ جانا جن سے ہندوستان کے اردو ادب کی اہمیت کم ہوتی ہے کسی طرح مناسب نہیں۔ اس مضمون میں بعض جملے ایسے نظر آتے ہیں جو کافی حد تک گمراہ کن ہیں۔ اردو کی اہمیت نظر انداز کرنے والے اور متعصبانہ ذہنیت رکھنے والوں کے لیے تو ایسے جملے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

مظفر علی سید کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنے کے بعد راہی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ مظفر علی سید کے مضمون کا اقتباس دیکھیے۔

"ردیف کا رواج اپنی جگہ ہمارے لیے ایک تنبیہ کا حکم رکھتا ہے یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم عربیت اور فارسیت زدگی میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور اردو زبان کے دیسی پن کو بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ ہم پر واضح کرتا ہے کہ میر اور سودا کے پہلے نانک اور کبیر نے اس زبان کی داغ بیل ڈالی تھی جسے ہم آج اردو کا نام دیتے ہیں۔"

اقتباس پیش کرنے کے بعد راہی صاحب رقم طراز ہیں۔

"صاحب یہ تو سراسر کفر کی باتیں ہیں۔ کہاں اردو اور کہاں نانک اور کبیر۔ یہ شخص مظفر علی سید اچھی بھلی اسلامی بھاشا کو ہندو اور سکھ بنائے دے رہا ہے۔"

اردو کو اس انداز میں اسلامی بھاشا کہنا کسی طرح مناسب نہیں ایسے غیر واضح جملے اردو کی حیثیت و اہمیت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس سے یقیناً ہی لوگ یہی سمجھیں گے کہ اردو کا ایک ذمہ دار ادیب و شاعر بھی اردو کو اسلامی بھاشا کہتا ہے۔

راہی صاحب کے مضمون کا آخری حصہ بھی کچھ موزوں و مناسب نہیں۔ انھوں نے آخری جملوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی گمراہ کرنے والے اور غلط ہیں۔ راہی صاحب نے پاکستانی شاعروں کے یہاں دیوی دیوتاؤں کے ذکر کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیبی عناصر کی طرف اشارہ ہی نہیں کیا بلکہ ثبوت میں نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے لیکن ہندوستان کی جدید اردو شاعری پر اردو ہی کا ایک شاعر لکھتا ہے۔

"ہندوستانی اردو کویتا آج بھی ان دیوی دیوتاؤں سے کترا کر نکل رہی ہے اور یہاں آج بھی ایک ایسی بھاشا کا پریوگ ہو رہا ہے جس پر فارسی کی گہری چھاپ ہے۔"

تعجب ہے کہ راہی صاحب نے یہ فیصلہ کیوں اور کیسے دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیوی دیوتاؤں کے ذکر کے بغیر تہذیبی عناصر کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

اس اقتباس کے پہلے حصہ سے یہی سمجھا جائے گا کہ اردو شعراء قصداً دیوی دیوتاؤں کے ذکر سے کتراتے ہیں۔ اور اس کترانے کی وجہ جب تلاش کی جائے گی تو مختلف خیال و ذہنیت رکھنے والے طرح طرح کے نتائج اخذ کریں گے، جس سے اردو کی جدید شاعری اور شاعروں کے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

راہی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہاں آج بھی ایک ایسی بھاشا کا پریوگ ہو رہا ہے جس پر فارسی کی گہری چھاپ ہے۔ آج کے شاعر طرح طرح کے تجربے کر رہے ہیں۔ فارسیت کا غلبہ بھی بہت کچھ کم ہو گیا ہے۔ بعض شاعروں نے ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں جن پر فارسی کی گہری چھاپ نہیں ہے۔

راہی صاحب نے مضمون کے آخری حصہ میں ہندوستان سے پاکستان جانے والے اور پاکستانی علاقہ سے ہندوستان آنے والے شاعروں کی روایات کا فرق پیش کیا ہے۔ اس آخری جملے نے اس پیراگراف کی اہمیت ہی ختم کر دی۔ یہ جملے گمراہ کن ہیں۔ اس کا ثبوت خود مضمون کے آخری حصہ کا عنوان ہے "ہندوستانی اردو کویتا ابھی بھی کتراتی ہے"۔ غالباً یہ عنوان ادارہ دھرم یگ نے ہی قائم کیا ہے راہی صاحب نے نہیں۔ اس عنوان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ راہی صاحب کے ان جملوں سے کیا سمجھا گیا۔

میں راہی صاحب کو کوئی رائے نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انھیں ایسے جملے لکھتے ہوئے کافی احتیاط برتنی چاہیے۔ تاکہ ہندی والوں کو غلط رائے قائم کرنے کا موقع نہ ملے۔ کاش کہ وہ آدھونک ہندوستانی اردو شاعری کی بھارتی آتما کے عنوان سے ایک دوسرا مضمون لکھیے۔ ہندوستان کی اردو بھارتی آتما کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔

مراسلات

تذکرہ گلزار اعظم

۱۵ دسمبر ۱۹۶۳ء میں جناب رئیس مینائی صاحب نے "جامع الاخبار" مدراس کے سلسلہ میں ایک کتاب گلزار اعظم کا تذکرہ کیا ہے۔ اور فٹ نوٹ میں "سخندان بلند فکر" مولفہ مولوی محمد منور صاحب کے حوالے سے اس کتاب کو نواب اعظم (غلام غوث خاں بہادر رئیس کرناٹک) کی تصنیف قرار دیا ہے۔

عام طور پر تذکرہ اعظم کے متعلق اب تک یہی خیال تھا کہ یہ نواب اعظم کی تصنیف ہے مگر افضل العلما محمد یوسف کوکن صاحب ایم۔ اے ریڈر شعبۂ عربی فارسی و اردو کی جدید تحقیقات سے جو انھوں نے اپنی کتاب "خانوادہ بدر الدولہ" مطبوعہ ۱۹۶۳ء کے سلسلہ میں کی تھی یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ کتاب شیریں سخن خاں راقم کی تصنیف ہے "خانوادہ بدر الدولہ" میں حاجی قادر مرتضیٰ حسین سالار الملک کے حالات کے ضمن میں صفحہ ۲۳۲ پر اس کتاب کا ذکر ہے عبارت کتاب ان کے (سالار الملک) فارسی خط سے ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ "تذکرہ گلزار اعظم نواب غلام غوث خاں بہادر کی تصنیف مانی جاتی ہے مگر سالار الملک کے ایک خط سے جو انھوں نے نواب اعظم کے نام لکھا ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تذکرہ درحقیقت افضل الشعرا مولوی محمد حسین شیریں سخن خاں بہادر راقم کا لکھا ہوا ہے۔ راقم مولوی محمد حسین امام المدرسین کی اولاد سے تھے اور مولوی ابوطیب خاں والا المتوفی ۸ صفر ۱۲۰۲ھ کے چہیتے شاگرد ہونے کی وجہ سے نواب غلام غوث خاں بہادر کے دربار سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ راقم نے اس تذکرے کے ذریعہ اپنے مخلصین خاص کر مولوی محمد مہدی واصف فرزند مولوی عارف الدین خاں رونق المتوفی ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۰۷ھ سے خوب انتقام لیا ہے۔ اسی پر حاجی قادر مرتضیٰ حسین خاں سالار الملک نے نواب صاحب کو لکھا ہے۔" اس کے بعد کے صفحات پر سالار الملک کا اصل فارسی خط اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس پورے خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سالار الملک نے اس کتاب کو نواب اعظم کے نام سے طبع کیا جانا بعید از مناسب سمجھا تھا اور نواب صاحب سے درخواست بھی کی تھی کہ وہ اصل حقیقت کا اظہار کر دیں۔

(ذاکرہ غوث)

میر کی سیادت

(۱) مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "چند سال بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو، ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔" آزاد کا یہ بیان بے بنیاد ہے اور اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ جب میر کی عمر دس گیارہ برس کی تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور میر نے شاعری اس کے کم از کم دس سال بعد اپنے استاد کے کہنے پر شروع کی تھی اس لیے ان کے والد کی یہ تنبیہ تاریخی حیثیت سے بالکل غلط ہے۔

اگر ہم خود میر کے زبانی بیان کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ یقینی سید تھے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کا نام میر محمد علی لکھا ہے

"خواجہ محمد باسط کہ برادر زادہ صمصام الدولہ امیر الامرا بود عنایتی بحال من کردہ پیش نواب برد۔ چوں مرا دید پرسید کہ ایں پسر از کیست؟ گفت از میر محمد علی است۔" دوسرے وہ خود اپنے کو ہر جگہ "میر محمد تقی" لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے اشعار میں بھی انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

سجدہ کریں ہیں سن کر اوباش سارے اس کو
سید پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا

اے غیر! میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کے
ذات مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو

اور ان کی اس ذات مقدس سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔؟

(۲) احوال غالب میں ذوق کا نام "مرزا محمد ابراہیم خاں" لکھا ہوا ہے لیکن "یادگار شعرا" (ڈاکٹر اسپرنگر) "مجموعۂ نغز" (حکیم میر قدرت اللہ قاسم) "عمدۃ المنتخب" (میر محمد خاں سرور) "گلشن بے خار" (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) "گلستان بے خزاں" (حکیم میر قطب الدین باطن) "سراپا سخن" (سید محسن علی محسن لکھنوی) "گلستان سخن" (مرزا قادر بخش صابر) "یادگار دہلی" (مولوی سید احمد دہلوی) "سخن شعرا" (عبد الغفور خاں نساخ) "رسالہ قواعد صرف و نحو اردو" (مولوی امام بخش صہبائی) "آب حیات" (مولانا محمد حسین آزاد) اور "آثار الصنادید" (سر سید احمد خاں) جیسی کتابوں میں ان کا نام "شیخ محمد ابراہیم" درج ہے۔ ذوق کے نام کے

ساتھ "خان" کا لفظ کوئی حیرت کی بات نہیں (حالانکہ اب تک کی تحقیق سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھیں "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔ البتہ "خاقانی ہند" کے خطاب سے اکبر شاہ نے ان کو ملک الشعرائی کا عہدہ عطا کر دیا تھا (آب حیات)۔ سر سید احمد خاں نے "شاہ سخنوری" لکھا ہے (آثار الصنادید) غالب نے "سلطان الشعراء" کے خطاب سے یاد کیا ہے (کلیات نثر غالب۔ سرگذشت غالب) اور ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے ان کو "طوطی ہند" کہا تھا ؎

طوطی ہند حضرت استاد ذوق نے
لی گلشن جہاں سے جب کہ رہ جناں کی
سال وفات جو کوئی پوچھے تو لے ظفر
کہہ ذوق عشق زمر بخشش الٰہ

۱۲۷۱ھ (سخن شعراء از احمد ولی الہی)

کیونکہ لفظ "خان" کا استعمال کسی بھی شخص کے نام کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ذوق کے نام کے ساتھ "مرزا" کا لفظ البتہ کھٹکتا ہے۔ کیونکہ مندرجہ بالا کتابوں میں انھیں "مرزا" کی بجائے "شیخ" لکھا گیا ہے۔

(۳)۔ محمد انصار اللہ نظر صاحب کے پیش نظر حکیم کاشف لکھنوی کا جو تیرہ پشتوں کا شجرہ ہے اور تذکرہ نویسوں نے انھیں متفقہ طور پر سید لکھا ہے۔ لیکن ان کے بزرگوں اور عزیزوں کے ناموں کے آخر میں لفظ "مرزا" کا الحاق بھی ہے۔ تو میرے خیال میں "مرزا" کا لفظ اگر خطاب کی حیثیت رکھتا تو تذکروں میں اس کا ذکر ضرور آتا۔

اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ لفظ خطاب کی حیثیت نہیں رکھتا تھا تو پھر کیونکر استعمال ہوا؟ جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "کسی فرد کے نام کے ساتھ شیخ، سید، میر، مرزا خواجہ یا خان کا الحاق اس بات کے لیے سند نہیں ہو سکتا کہ وہ شخص کسی خاص قبیلہ یا نسب سے واقعی متعلق ہے۔"

اگر یہ سب صحیح ہے اور ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں تو مرزا الفتہ مرزا راجہ نانکڑ غلام دہلوی، مرزا محمد ابراہیم خاں ذوق یا شیخ محمد ابراہیم ذوق، میر تقی میر کے ناموں سراج الدین علی خاں اور ان کے خاندان کے کئی افراد کے ناموں کے ساتھ "شیخ" کا لفظ، اور کاشف لکھنوی کے بزرگوں اور عزیزوں کے ناموں کے آخر میں لفظ "مرزا" کے الحاق کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے لیے میر تقی میر کو ہی لیجیے۔ انھوں نے ہر جگہ خود کو "سید" لکھا اور کہا ہے۔ لیکن ان کے دوسرے صاحبزادے کا نام "میر فیض علی خاں فیض" تھا؟

(مناظر عاشق ہرگانوی)

ایک قابل تحسین کارنامہ

آپ کی اطلاع کے لیے تحریر ہے کہ حیدرآباد پوسٹ آفس ایڈوائزری کمیٹی میں جو ۱۰ر اکتوبر کو منعقد ہوئی میں نے حسب ذیل قرارداد پیش کی۔

"یہ کمیٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کے اس فعل کو بنظر استحسان دیکھتی ہے کہ مختلف ڈاک خانوں کے ناموں کی تختیوں اور لیٹر بکسوں پر انگریزی اور تلگو میں ڈاکخانوں کے نام، حلقوں کے نمبر اور لیٹر بکسوں کے کھولنے کے اوقات درج کر دئے گئے ہیں چونکہ اردو کو آندھرا پردیش کی دوسری علاقائی زبان کا درجہ حاصل ہے اس لیے اس کمیٹی کی رائے میں جن جن مقامات کی آبادی کا بیس فیصدی حصہ اردو بطور مادری زبان کے بولتا ہے وہاں ڈاکخانوں کے نام کے تختیوں اور لیٹر بکسوں پر اردو زبان میں بھی یہ اطلاعیں درج کی جائیں۔"

آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ نہ صرف یہ قرارداد منظور ہوئی بلکہ اس پر کم سے کم شہر حیدرآباد میں عمل ہونے لگا ہے اور لیٹر بکسوں پر آہستہ آہستہ اردو میں بھی ضروری اطلاعات درج کی جا رہی ہیں۔

(ہارون خاں شیروانی)

نوٹ:۔ اردو دوست شیروانی صاحب کی طرح کوشش کرتے رہیں تو بہت کچھ ہو جائے (ادارہ)

انجمن پنجاب کا وفد صوبے کے گورنر، وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم سے ملے گا

چنڈی گڑھ۔ ۲۸ر دسمبر۔ پنجاب میں اردو زبان کو اس کا جائز مقام دلوانے، اردو زبان میں دی جانے والی درخواستوں سے متعلق تکالیف، اسکولوں میں اردو کی تعلیم اور اردو زبان کے دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند پنجاب شاخ کا ایک وفد بہت ہی جلد جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب گورنر پنجاب، کامریڈ رام کشن صاحب وزیر اعلیٰ اور شری پر بودھ چندر صاحب سے ملاقات کر رہا ہے اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو پنجاب برانچ کے جنرل سکریٹری شری اوم پرکاش ملک نے ان تمام حضرات کو خط لکھ دیئے ہیں معلوم ہوا ہے کہ یہ وفد جناب ملک صاحب کے علاوہ جناب تجونت رائے ساحر شامی۔ جناب اے، جی انجل (انبالہ چھاؤنی) پروفیسر آر ڈی ضیا (چنڈی گڑھ) حکیم اجمل خاں (گوڑ گانوہ) اور جناب سردار ی لال شبنم پر مشتمل ہوگا

(آواز ہند انبالہ چھاؤنی)

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

ان کو آپ کے ساتھ جس قدر خلوص اور محبت تھی، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ رات کو پلنگ پر سونے سے پہلے وہ ہمیشہ سب کے لیے دعائیں مانگتے تھے، اس وقت ناممکن تھا کہ وہ آپ کو بھول جاتے آپ کے خطوں کا خاص بے چینی کے ساتھ انتظار رہتا تھا جس روز خط ملتا تھا، ان کے جوش کی کوئی حد نہیں ہوتی تھی۔

یہ بھی ان کی کیا کم خوش نصیبی ہے کہ آپ
سے سچے دوست ان کے واسطے خلوص دل سے
دو قطرہ آنسو گرانے والے دنیا میں موجود ہیں۔"

مہدی افادی کی وفات کے بعد ان کا ذوق مطالعہ ختم ہو تا گیا۔ انھیں نہ تو نئے رسالوں اور نئی کتابوں کا علم تھا اور نہ نئے لکھنے والوں کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ نئے دور کے نقادوں میں وہ پروفیسر آل احمد سرور سے بخوبی واقف تھیں "مکاتیب مہدی" پر ان کی ریڈیائی تقریر انھوں نے سنی تھی اور اس کے بہت سے جملے نوٹ کر لیے تھے۔ انھیں کتابوں کے مطالعہ کرنے اور لوگوں کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ مہدی افادی کا مزار ان کے گھر کے آنگن میں ہے، ان کی حیثیت شمع مزار کی تھی جو اقبال کے الفاظ میں اس لیے جلتی تھی کہ اس کی فطرت میں سوز مضمر تھا۔ اب وہ شمع بجھ گئی اور اب وہ مزار اس طرح سونا ہو گیا۔

نے نصیب غنچے را نے قسمت کا شانہ را

تصحیح

۸ رنومبر ۹۴ء کے ہماری زبان میں ص۔۱۰ پر انجیتہ سے لے کر اندور کے متعلق ایک خبر درج کی گئی ہے جس کے مطابق

"۱۹۴۷ء سے قبل یہاں کے تقریباً تمام کالجوں میں ایم۔ اے تک اردو اور فارسی کی تعلیم کا معقول انتظام تھا۔ ۔ ۔ ۔ آگرہ یونیورسٹی اور وکرم یونیورسٹی اور اب اندور یونیورسٹی میں بھی باقاعدہ طور پر شعبۂ اردو قائم کر دیا گیا ہے۔"

یہ بیانات جھوٹ کی پوٹ ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اندور کے کسی کالج میں ایم۔ اے تو درکنار بی۔ اے میں بھی اردو یا فارسی نہ تھی۔ نیز یہ کہ آگرہ یونیورسٹی، وکرم یونیورسٹی یا اندور یونیورسٹی میں سے کسی میں بھی شعبۂ اردو باقاعدہ یا بے قاعدہ طور پر قائم نہیں کیا گیا۔

۱۵ رنومبر ۹۴ء کے "ہماری زبان" میں ص ۱۱ پر بھوپال میں تحقیقی مقالے" کے عنوان سے درج ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا پی۔ ایچ ڈی کا موضوع "تاریخ کی اردو ادب کو دین" ہے یہ صحیح نہیں، سحر صاحب کا موضوع امیر مینائی ہے۔

(گیان چند جین)

کل ریاست میسور اردو کانفرنس کے انعقاد کی تیاری

حسب اعلان کل ریاست میسور اردو کانفرنس کی مجلس منتظمہ کا اجلاس بمکان جناب محمود شریف صاحب ایڈوکیٹ، صدر، انجمن ترقی اردو ہند (ریاست میسور) بروز شنبہ مورخہ ۲۴ دسمبر ۹۴ء شام کے ۴ بجے شروع ہوا۔ گذشتہ اجلاس کی روداد کی پیشگی کے بعد حسب ذیل امور پر غور و خوص اور بحث کے بعد فیصلے کیے گئے

طے پایا کہ کل ریاست میسور اردو کانفرنس ۱۲ اور ۱۴ فروری ۹۵ء شہر بنگلور میں منعقد کی جائے محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون کی یہ تجویز اور پیش کش نہایت ہی خوشی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی گئی کہ انھیں دنوں کانفرنس ہی کی جگہ بزم اردو فارسی مہارانی کالج بنگلور کی جانب سے مجوزہ آل انڈیا اردو مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ کانفرنس اور مشاعرہ کی مجالس منتظمہ نے ایک دوسرے سے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

کانفرنس میں شرکت کے لیے مندرجہ ذیل اکابرین زبان و ادب کو مدعو کرنے کی تجویز منظور ہوئی اور ان حضرات کے نام خطوط لکھے گئے۔ (۱) جسٹس آنند نرائن ملا صاحب، انجمن ترقی اردو اتر پردیش (۲) پروفیسر آل احمد سرور صاحب، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند (۳) ڈاکٹر تارا چند، ایم۔ پی۔ اور (۴) پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدر آباد۔

فیصلہ ہوا کہ کانفرنس کے انعقاد کے موقعہ پر ایک خوبصورت اور معلوماتی ساوینیر شایع کیا جائے ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے مجلس منتظمہ نے مندرجۂ ذیل عہدیدار منتخب کیے۔

(۱) جناب محمود شریف صاحب ایڈوکیٹ صدر کانفرنس

(۲) عزت مآب منصور علی خاں صاحب نائب وزیر۔ صدر مجلس استقبالیہ۔

(۳) جناب شیخ مصلح الدین صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ سید غوث محی الدین صاحب مدیر الکلام۔ سید باقر رضا واسطی اور منظر اسید صاحب۔ سکریٹریان

(۴) جناب صادق سہیل صاحب وکیل۔ خازن۔

کانفرنس کی تشہیر و اشاعت کے لیے ایک پبلسٹی کمیٹی تشکیل دی گئی جو حسب ذیل اراکین پر مشتمل ہے۔

(۱) مولوی محمد خاں صاحب سابق لکچرار مہاراجہ کالج (۲) حکیم فضل

شریف وجدی صاحب (۳) میر جعفر علی خاں صاحب ایم اے مدیر "اکیکا میسور" کے حبیب اللہ خاں صاحب وکیل اور حضرت شوق بنگلوری۔ سادیبر کمیٹی کے ارکین کا اعلان آئندہ اجلاس میں کرنے کا فیصلہ ہوا۔ دو نائبین صدر استقبالیہ کمیٹی کی ضرورت محسوس ہوئی ان کی نامزدگی کا حق صدر کو دیا گیا۔

مجلس استقبالیہ کی رکنیت کی فیس کم از کم پانچ روپیہ مقرر ہوئی۔ رکنیت سازی کی ذمہ داری بنگلور کے تمام ادبی اور ثقافتی ادارے اور مجلس منتظمہ کے اراکین نے قبول کی۔ رکنیت سازی کے لیے رسید بکس جاری کی گئیں۔

مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ ریاست میسور کے کونے کونے میں جہاں بھی ایسے ادارے اور اشخاص ہیں جو اردو کی بقا و تحفظ کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں ان سب سے اپیل کرے کہ وقت کے تقاضے کے پیش نظر کانفرنس کی اہمیت کو سمجھ کر اس کے انعقاد اور کامیابی کے لیے ہر طرح کا تعاون کریں، اپنی اپنی آرا و مشوروں سے جلد مطلع فرمائیں۔ اپنے اپنے مندوب زیادہ سے زیادہ تعداد میں ضروری تجاویز اور مشوروں کے ساتھ روانہ کریں۔ ریاست کے ہر اردو داں سے اپیل کی گئی کہ اپنی مادری "زبان" کو فنا ہونے سے بچانے کا یہی وقت ہے اس وقت تھوڑے ایثار اور قربانی سے کام لیکر عملی جد و جہد میں حصہ لیں۔

تفصیلات حاصل کرنے اور رائے مشورے ارسال کرنے کے لیے۔ سکریٹری سے رجوع کریں۔

پتہ۔ شیخ مصلح الدین بی۔ ایس۔ سی۔ سکریٹری اردو کانفرنس
۳۸۲ III بلاک جیا نگر۔ بنگلور ۱۱

پنجاب میں محبانِ اردو کی سرگرمیاں

جناب مہر چند کوثر اطلاع دیتے ہیں کہ جے پور اردو کانفرنس میں پنجاب سے متعلق پاس ہوئی قرارداد کی تشہیر و توثیق اور پنجاب اردو کنونشن کی تیاریوں کے سلسلے میں برنالہ (ضلع سنگرور) (پنجاب) کے مقامی اردو دوستوں کی ایک میٹنگ سردار بلونت سنگھ صاحب ایڈووکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوئی کوثر صاحب نے میٹنگ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے جے پور اردو کانفرنس کی کارروائی پر روشنی ڈالی اور کل ہند اردو کانفرنس جے پور میں پنجاب سے متعلق پاس شدہ قرارداد کی نقل اجلاس کے سامنے پیش کی۔ میٹنگ نے اس قرارداد کی پرزور تائید اور توثیق کی۔ حاضرین کو بتایا گیا کہ اکتوبر میں جے پور کانفرنس سے واپسی پر کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں اور پنجاب کے دیگر اردو دوستوں نے پٹیالہ میں ایک میٹنگ کر کے عنقریب پنجاب کے محبانِ اردو کی ایک عظیم الشان کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہو جس میں مرکزی انجمن ترقی اردو کے نمائندے بھی شرکت کریں گے اور یہ بھی بتایا کہ آج کی میٹنگ ہونے والی اس کنونشن کی ابتدا تشہیر، تیاری اور منظوری کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ حاضرین نے اس خیال اور تجویز کی اتفاق رائے سے حمایت کی۔ اور مجوزہ کنونشن کے لیے ہر تعاون کا یقین دلایا خصوصاً صدر اجلاس سردار بلونت سنگھ صاحب نے ہر قسم کی مالی، آئینی اور اخلاقی امداد کرنے کے علاوہ ہر خدمت کے لیے خود کو پیش فرمایا۔ صدر محترم نے زور دیا کہ پنجاب میں اردو تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے ہر ممکن جد و جہد کی جائے۔

آخر میں حاضر اردو شعرا نے اپنے کلام سے اہل مجلس کو محظوظ کیا۔ شعرا میں جناب کوثر، جناب اثر، جناب شاطر، اور جناب شیدا کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برنالہ کے علاوہ سنگرور، رامپورہ پھول اور مالیر کوٹلہ میں بھی ایسی میٹنگیں منعقد ہونے کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔

(شوروج تنویر۔ چنڈی گڑھ)

یہ شعر کس کا ہے

(۱)

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی
تپیدنِ دل مرغانِ رشتہ بر پا را

عام طور پر یہ شعر نظیری کے نام سے مشہور ہے لیکن دیوان نظیری میں مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ اگر کوئی صاحب واقف ہوں تو بتانے کی زحمت کریں۔ (سید محمد عقیل۔ الہ آباد یونیورسٹی)

(۲)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

(چندر دیپ)

اردو کے کارکنوں کا اجتماع

آندھرا پردیش میں اردو کو علاقائی زبان کا موقف حاصل ہونے کے باوجود اردو کی ترقی میں بعض ایسی رکاوٹیں ہیں جو بار بار سامنے آتی ہیں۔ یہ دشواریاں اور مواخذات کسی مخالف پالیسی کا نتیجہ نہیں ہیں اور نہ حکومت سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنی پالیسی کو روبعمل لانے میں تامل یا گریز کرتی ہے جب کبھی حکومت سے کسی شکایت کے بارے نمائندگی کی جاتی ہے اس کا انسداد کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا جاتا لیکن اس کے باوجود اردو تعلیم اور اردو داں ملازمین سے متعلق اکثر شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ریاست میں اردو کے مسائل پر غور کرنے کے لیے اضلاع کی انجمنوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس طلب کرتے ہوئے مشکلات و حالات کا جائزہ لینے کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔ اضلاع و متعلقہ جات کی انجمنوں کی زیادہ تر شکایات مدارس میں اردو تعلیم ہی سے متعلق ہے۔ یہ حکومت کی واضح پالیسی ہے کہ جہاں اردو ذریعہ تعلیم کے دس طلباء موجود ہوں وہاں اردو جماعت قائم کی جائے۔ حکومت سے نمائندگی ہی پر یہ بھی طے پایا کہ نئی جماعتوں کے قیام کے لیے طلبوں کا لزوم عائد نہ کیا جائے یا اصرار نہ کیا جائے۔ لیکن یہ شکایت ہنوز باقی ہے کہ اضلاع میں اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں قائم نہیں کی جاتی ہیں۔ یا اگر قائم ہیں تو اساتذہ کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ اردو داں اساتذہ کو تلگو مدارس میں مامور کیا جاتا ہے۔ ایسی شکایتیں عام بات ہو گئی ہیں۔ کسی جگہ شکایت کے بہت بڑھ جانے پر جب محکمہ تعلیمات سے نمائندگی کی جاتی ہے تو فوراً اس کا انسداد کیا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نظامت تعلیمات بھی حکومت کی پالیسی کو روبعمل لانے میں تامل نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ شکایت برقرار ہے اور غالباً اضلاع کی سطح پر دفاتر تعلیمات ہی سے یہ شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس شکایت کے انسداد کے لیے ایک مشورہ یہ بھی دیا جا رہا ہے کہ محکمہ نظامت تعلیمات میں اردو داں نائب ناظم اگر رہے تو موجودہ شکایات کا بڑی حد تک انسداد ہو سکتا ہے۔ مگر یہ شکایت صرف انتظامی ہی نہیں۔ چونکہ مدارس کا تقرر و نسق ضلع پریشد کے تحت دے جانے کے باعث بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ اساتذہ کی بڑی تعداد میں تبادلے بھی اردو کی مشکلات میں اضافے کا سبب ہیں۔

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کسی کانفرنس یا بڑے اجتماع کے بغیر انجمن کے نمائندوں اور اردو کے بہی خواہوں اور دوستوں کے ایک اجتماع کے ذریعہ مسائل کا جائزہ لینے کی جو کوشش کی ہے وہ بہت بروقت ہے۔ امید ہے کہ اس اجتماع کے مباحث اور نتائج سے حکومت کو واقف کرتے ہوئے مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی چونکہ یہی وہ وقت ہے جبکہ اضلاع میں اردو تعلیم کے انتظام کو مستحکم بنایا جائے۔ ورنہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جس کسی مقام پر اردو جماعتوں کی برخاستگی پر کوئی توجہ نہیں کی گئی وہاں اردو تعلیم کا انتظام بھی ختم ہو رہا ہے۔

اردو کے مسائل صرف مدارس میں اردو جماعتوں کے قیام ہی تک محدود نہیں ہیں دفاتر میں اردو کا استعمال اور اردو داں افراد کا تقرر بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اب مجلس بلدیہ حیدرآباد کے اردو داں ملازمین کا مسئلہ سامنے آ رہا ہے۔ مجلس بلدیہ میں اردو داں ملازمین کی اکثریت ہے اور اردو ہی دفتری زبان بھی ہے۔ لیکن اب دیگر تمام دفاتر کی طرح بلدیہ میں بھی انگریزی کے استعمال کا رجحان ہے۔ اگرچہ یہ کسی اردو دشمنی کا نتیجہ نہیں ہے اور زبانوں کے تعین کے عبوری دور میں ایسی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ مگر اردو داں ملازمین میں جو بے چینی موجود ہے اس کا کوئی حل تلاش کرنا ہی چاہیے۔ اسی طرح سے ایسے ملازمین ہیں جنھوں نے مدت مقررہ میں تلگو کا امتحان کامیاب نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کے گریڈز اور استقلال کا مسئلہ سامنے آیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ انجمن کو مستحکم بنایا جائے۔ انجمن کی شاخیں زیادہ تعداد میں قائم ہوں تاکہ انجمن حکومت سے اپنے مسائل کا تصفیہ کرے اور خود بھی مستحکم ہو کر اردو ادب میں اضافہ کے لیے توجہ کر سکے۔ چونکہ اردو کے تحفظ کی ذمہ داری صرف حکومت پر ہی نہیں بلکہ عوام پر بھی عائد ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری بھی کما حقہ پوری ہونی چاہیے تاکہ اردو جو مشترکہ تہذیب و تمدن کی مظہر ہے، ہمارے ملک میں اپنا تاریخی رول بدستور انجام دیتی رہے۔ انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا خاموش اجتماع کام کی مخلصانہ لگن کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اس دائرہ کو بہت وسیع ہونا چاہیے۔ یہ فرض اردو کے تمام دوستوں، بہی خواہوں اور حامیوں کا ہے کہ وہ ایک مرکز پر جمع ہوں اور مشترکہ طور پر کام کریں۔

(اداریہ سیاست حیدرآباد)

انجمن آندھرا پردیش کی شاخوں کے صدور و معتمدین کا اجتماع

حیدرآباد ۳۰ر دسمبر۔ صدر انجمن اردو آندھرا پردیش نواب میر احمد علی خاں وزیر داخلہ نے آج یہاں کہا کہ سارے ہندوستان میں ریاست آندھرا پردیش ہی میں اردو کا موقف مضبوط اور مستحکم ہے اور اردو دوسری زبان بولنے والوں میں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہے اس وقت ریاست میں ۴۰ لاکھ عوام اردو بولتے ہیں۔ صدر انجمن ترقی اردو نواب میر احمد علی خاں آج صبح اردو ہال حمایت نگر میں انجمن ترقی اردو کی ریاست آندھرا پردیش کی تمام شاخوں کے صدور و معتمدین کے اجتماع کو مخاطب کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ترونچی میں سو فیصد اور اس کے اطراف و اکناف میں (۳۰) فیصد اردو بولی بھی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ریاستی حکومت نے

اردو زبان کو جس کا حق دیا ہے اس تعلق سے ریاست کے کسی بھی حصہ میں حکومت کی پالیسی کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا ہو تو یہ بات ان کے علم میں لائی جائے وہ اس پر ضروری اور موثر کارروائی کریں گے

جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے ابتدا میں ریاست کی تمام شاخوں کے صدور و معتمدین کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاستی حکومت نے تلگو کی طرح اردو نصابی کتب کو تیار کرنے سے اتفاق کر لیا ہے انھوں نے بتایا کہ آندھرا پردیش کی حکومت نے تلگو کے ساتھ اردو کو بھی اس ریاست کی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے حکومت کے ذمہ دار نمائندوں نے مختلف پلیٹ فارموں سے بارہا اس کا اعلان کیا ہے اور ان اعلانات پر ملک کے انصاف پسند افراد اور جماعتوں نے ہماری ریاستی حکومت کی تعریف کی ہے اردو بولنے والوں کو کچھ حقوق حاصل ہیں اب ہمیں یہ دیکھنا کہ ان حقوق پر برابر عمل ہو رہا ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہو رہا ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں اور ان اسباب کو دور کرنے کے لیے ہمیں کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں اردو بولنے والوں کو زبان کی حد تک جو مسائل در پیش ہیں وہ ہماری سماجی زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت شعبۂ تعلیم کو حاصل ہے اگر ہماری آنے والی نسلیں اردو لکھنے پڑھنے ہی سے محروم رہیں تو آگے چل کر اس زبان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والے ہی باقی نہیں رہیں گے ابھی کوئی چار مہینے پہلے لسانی اقلیتوں کے مدد گار کمشنر حیدرآباد آئے تھے تو ریاستی انجمن ترقی اردو نے ان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اردو تعلیم کے موجودہ اہم مسائل کی طرف انھیں متوجہ کیا گیا تھا جناب حبیب الرحمٰن نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا یہی وہ مسائل ہیں جن کا جلد از جلد تشفی بخش طریقہ پر حل کیا جانا ضروری ہے اردو کے تین پہلو ہیں جن کے متعلق ہمیں آج کل بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ایک اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتوں کا قیام دوسرے اردو اساتذہ کی فراہمی تیسرے اردو میں نصابی کتب کی تیاری۔ ریاست کے اندرونی علاقوں سے ہمیں جو شکایتیں وصول ہوتی ہیں وہ سب ان ہی تین امور سے تعلق رکھتی ہیں اکثر مقامات پر باوجود کافی تعداد ہونے کے اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں نہیں کھولی جاتیں۔ اور جب مطالبہ کیا جاتا ہے تو سرکاری کارروائی کے کچھ ایسے پیچ و خم درمیان میں آجاتے ہیں کہ مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں اس مطالبہ کی تکمیل نہیں ہونے پاتی۔ اور اردو بولنے والے بڑی بددلی اور مایوسی میں مبتلا ہو جاتے اور مزید کوششوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اس آخری مسئلہ کے تعلق سے میں اپیل کرتا ہوں ...... کہ کسی مقام پر سرکار کی طرف سے اردو تعلیم کا انتظام ہونے کے انتظار میں آپ اپنے بچوں کو اردو سیکھنے سے محروم نہ رکھیں بلکہ خود اپنے طور پر کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کریں کہ بچے اپنی مادری زبان میں کم از کم معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔ یہ کوئی بہت زیادہ دشوار کام نہیں ہے شرط یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی خاطر کچھ تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہوں

مسٹر سردار جمیل سکریٹری انجمن ترقی اردو (جگی پیٹ) نے ضلع میدک میں اردو کے موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے ساتھ کی جانے والی بے جا ناانصافیوں کی چھان بین کے لیے ہر ضلع میں ایک اردو اسپیشل آفیسر کا تقرر کیا جائے۔ انھوں نے کہا ضلع پریشد اور پنچایت سمیتیوں میں اردو کو اس کا جائز مقام دیا جانا چاہیے۔ تلگو مدارس میں اردو داں اساتذہ کے تقرر کے طریقہ کار کو بدلنے کا مطالبہ بھی کیا۔ **مسٹر پیر نظامی** (اننت پور) نے آندھرا پردیش یونیورسٹی میں اردو کو پوسٹ گریجویٹ کے نصاب میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا، اور کہا کہ آندھرا کے تلگو میڈیم مدارس میں اردو کو مضمون اختیاری کی حیثیت سے جاری نہیں رکھا گیا ہے۔ **مسٹر احمد محی الدین** (راجمندری) نے اس بات پر زور دیا کہ راجمندری کے تحتانوی مدارس میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیے سریکاکلم اور وجے واڑہ کے کالجوں میں اردو کو بحیثیت اختیاری مضمون نہیں رکھا گیا ہے۔

مسٹر نصرت فاروقی (محبوب نگر) نے (۵۵) سال سے کم عمر والے اردو داں مدرسین کو وظیفہ پر علحدہ کر دیئے جانے کے طریقہ کار پر سخت احتجاج کیا اور عدالتوں میں اردو درخواستوں کے انگریزی میں ترجمہ کے لزوم کو برخاست کر دینے پر زور دیا مسٹر افضل (چتور) نے کہا کہ طالبات کے لیے علحدہ مدارس نسواں نہ ہونے کی وجہ سے پانچویں جماعت کے بعد لڑکیوں کے لیے اپنی تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا ہے انھوں نے بتایا کہ چتور میں پانچویں جماعت کے بعد لڑکیوں کے لیے کوئی ذریعہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً لڑکیوں کو لڑکوں کے مدارس میں شریک کیا جا رہا ہے مسٹر نظیر پاشاہ (کرنول) نے کہا کہ وینکٹیشورا یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحانات اردو میں بھی منعقد کیے جانے چاہئیں نیز اردو میں امتحان میں شرکت کے لیے انٹرنس کا امتحان بھی منعقد کیا جانا چاہیے۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں آندھرا اور تلنگانہ کے الگ الگ اردو معیار کا خیال رکھنا ضروری ہے مسٹر ہیرالال موریا ایم۔ ایل۔ سی (کھمم) نے کہا ہے کہ حکومت کو اردو سے بغض نہیں چند عہدہ داروں کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں جن کا سخت مقابلہ کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم خاموش رہیں تو آئندہ دنیا میں اردو کا موقف کمزور ہو جائے گا۔ اردو زبان نے بین الاقوامی مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس لیے بھی اس کے ادب کی حفاظت اور اس کی تعلیم حکومت کا فرض ہے وزراء کے اردو سیکھنے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا مسٹر مصطفیٰ (نظام آباد) وغیرہ نے اپنے اضلاع میں اردو کے مسائل اور دشواریوں کا جائزہ لیا۔

(سیاست حیدرآباد)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔